علومِ اسلامیہ کی تشکیل جدید کی تاریخ

The history of modern formation of Islamic Sciences

Muhammad Rafique
Doctoral Candidate, Islamic Studies, Minhaj University Lahore:
engrnajam365@gmail.com
Dr Mumtaz ul Hassan
Associate Professor Islamic Studies, Minhaj University
Lahore:engrnajam365@gmail.com

Abstract

It is a matter of course that the education system has a fundamental role in the rise and fall of nation. The real strength and dynamism in the education system is due to the curriculum. This is the reason why the desired changes continue over the time in the curriculum of all educational institutions in the modern western countries. Even in Islamic history, Civilization and culture, educational centers and great academic figures did not let this importance go out of sight. The traditional education System is one of the challenges facing the Muslim Ummah in the present day. Especially in religious education, the required formation in front of the contemporary challenge, its importance is also recognized in its place. Like the efforts of Ijtihād in other fields, Shaykh ul Islām Dr. Muhammad Tāhir ul Qādrī has fulfilled his responsibility well in this regard as well. After making significant modifications in the curriculum of Jamia Islamia Minhaj ul Qurān and Dars Nizāmī, he has implemented them in the form of Nizām ul Amal in his institutions. In the following short article, we are presenting our proposals in this regard.

Keywords: Modern Formation, Education System, Contemporary Challenge, Islamic Civilization and Culture.

قرآن و سنت کی تعلیمات اِتحاد و یگانگت، باہمی اُخوت، تحمل و برداشت، روا داری اور اِعتدال و میانہ روی کا درس دیتی ہیں۔علومِ اسلامیہ کے ذریعہ نوجوان نسل کی ایسی فکری اور نظریاتی تربیت کی ضرورت ہے جس کے نتیجے میں وہ تنگ نظری، تعصب اور اِنتہا پسندی سے بالاتر ہوکر مذہبی

رواداری اور تحمل و برداشت کے اَوصاف سے متصف ہوں۔ وہ اپنے اچھے اخلاق و کردار کی بدولت بین المسالک و بین المذاہب رواداری کے پیامبر بن سکیں۔ لہذا علوم اسلامیہ کی تشکیل جدید میں ایسا نصاب وضع کرنے کی ضرورت ہے جس کے ذریعہ طلبہ و طالبات جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر معاشرے میں باعزت، باوقار، مؤثر، مثبت، کارآمد اور افادہ رساں کردار ادا کر سکیں اور آئندہ نسلوں کو صحیح دینی راہ نُمائی فراہم کر سکیں۔ اس مختصر مضمون میں، علوم اسلامیہ میں تشکیل جدید کی ضرورت و اہمیت پر بحث کے ساتھ ساتھ مختصر اً تاریخی تجزیہ پیش کیا جارہا ہے۔

ہمارا موجودہ نظام تعلیم مسلمانوں کی عصری ضروریات کو پورا نہیں کر رہا ہے۔ تعلیم کی غرض و غایت محض معلومات کی فراہمی یا پڑھنے لکھنے کی صلاحیت پیدا کرنا نہیں ہے۔ مقصد بعثت انبیاء علیہم السلام پر غور کیا جائے تو یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ تعلیم کتاب و حکمت ان کے مقاصد میں سے تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تعلیم کی غایت تزکیہ نفس بھی ہے۔ تزکیہ نفس کے بغیر علم کسی کام کا نہیں ہوتا لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ علوم اسلامیہ کی تشکیل نو اس طریقہ کی جائے کہ جس کے ذریعہ ایسے افراد تیار ہوں کہ ہمارا سماج ہی بدل جائے۔ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد بیان کرتے ہوئے قرآن کریم یوں گویا ہے:

﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝﴾(1)

"یقینا وہ مراد کو پہنچا جس نے (اپنے) اس (نفس یعنی روح) کو پاک کرلیا (سنوار لیا)۔ اور نامراد ہوا جس نے اس (روح عطیۂ الٰہی) کو خاک میں ملادیا۔"

﴿كَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَؕ ۝﴾(2)

"اسی طرح ہم نے تمہارے اندر تمہیں میں سے (اپنا) رسول بھیجا جو تم پر ہماری آیتیں تلاوت فرماتا ہے اور تمہیں (نفسًا و قلبًا) پاک صاف کرتا ہے اور تمہیں کتاب کی تعلیم دیتا ہے اور حکمت و دانائی سکھاتا ہے اور تمہیں وہ (اَسرارِ معرفت و حقیقت) سکھاتا ہے جو تم نہ جانتے تھے"

(1) الشمس، 9-10:91

al-Qurʾān, 91: 9-10.

(2) البقرۃ، 151:2

al-Qurʾān, 2: 151.

چنانچہ تزکیہ نفس کے ذریعہ اخلاقی فضائل کو انسانی شخصیت کے اندر دوام نصیب ہو جاتا ہے۔ اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ نے اپنے مقصد بعثت کے حوالے سے ان الفاظ میں فرمایا ہے:

«إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ».(3)

''بے شک میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں۔''

علوم اسلامیہ کے تشکیل نو کے ذریعہ افراد معاشرہ کی تربیت کے ایسے منہاج کی ضرورت ہے جو معاشرے میں انفرادی و اجتماعی سطح پر عصری تقاضوں کے مطابق فروغ علم و عمل کا باعث بنیں۔اس فصل میں علوم اسلامیہ کی تشکیل جدید کی روایت کا تاریخی جائزہ پر بحث کروں گا۔

عصری تقاضوں کے مطابق علوم اسلامیہ کی تشکیل نو

جنوب مشرقی ایشیاء میں اسلام کی آمد پہلی صدی ہجری ہی میں ہوگئی تھی۔محمد بن قاسم دور اموی (۹۳ھ۔۱۴۰ھ) ہی کی یاد گار تھے۔غزنوی، غوری اور خلجی ادوار میں صوفیائے کرام نے دعوت وتبلیغ کی شمع روشن کیے رکھی، جن کی کوششوں سے ہزاروں افراد حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ سولہویں صدی عیسوی (1526ء) میں مغلیہ دور بادشاہت کا آغاز ہوالیکن اپنی اٹھان کے ساتھ ہی دین الٰہی کے فتنے سے دو چار ہوگئی۔اللہ تعالیٰ نے اس فتنے کے مقابلے کے لیے ایک ہستی کا انتخاب کیا، جوتاریخ میں مجددالف ثانی (1524 - 1624ء) کے نام سے مشہور ہے اگر اس فتنے کا بر وقت مقابلہ نہ کیا جاتا تو آج اس علاقے کے مسلمانوں کی شاید یہ صورت بھی نہ ہوتی اوروہ اپنے تشخص سے کلی طور پر محرم ہو جاتے۔مجدد صاحب کے انتقال کے لگ بھگ ۸۰ سال بعد مغلیہ سلطنت کے دور زوال میں کمال حاصل کرنے والی ایک اور ہستی منصہ شہود پر جلوہ گر ہوئی اور یہ حضرت شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳ء۔۱۷۶۳ء) کی ذات گرامی تھی۔بر صغیر پاک و ہند کے مسلمان، شاہ ولی اللہ صاحب کے احسانات سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔آپ کی عالی ظرفی، آپ کا سیاسی شعور احکام شریعت کی حکمتوں پر آپ کی نظر، مغلیہ دور کی خرابیوں کا تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ وعلم حدیث

(3)البيهقي، أحمد بن الحسين. السنن الكبرى. مكة، المملكة العربية السعودية: مكتبة دار الباز، 1414ھ/1994م، ج:10، ص: 191، رقم الحديث: 20571.

Al-Bayhaqī, Abū Bakr Aḥmad bin al-Ḥusayn. Al-Sunan al-Kubrā. Makkah, Al-Mamlakah Al-'Arabiyyah Al-Su'ūdiyyah: Maktabat Dār al-Bāz, 1414AH/1994CE, v.10, p.191, Raqam al Hadith: 20571.

سے بے پناہ شغف فقہی مسائل میں اقرب الی الکتاب و السنہ کی جستجو غرض بے پناہ پہلو ہیں جن کی وجہ سے آپ بجا طور، امام الہند کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ شاہ صاحب کا انتقال ۱۷۶۳ء میں ہوا۔(4)

مولانا ابوالحسن ندوی نے مجدد دین اسلام کے کارناموں کے حوالے سے لکھا ہے:

''آپ جانتے ہیں کہ جن لوگوں نے اسلام کی تاریخ اصلاح و تجدید میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا اور مسلمانوں کے خیالات و رجحانات پر گہرا اثر ڈالا، وہ عموماً زبان و قلم کی طاقت رکھتے تھے اور ان کی تصنیفات یا تقریروں میں صحیح ادبیت اور بلاغت ہے، حضرت شیخ جیلانی کے مواعظ آج بھی زور بیان اور خطاب کا نمونہ ہیں، امام ربانی کے مکتوبات اپنی ادبیت، زور آور طلاقت، سلاست اور بے تکلفی میں ابو الفضل اور فیضی کی انشاء پردازی سے کہیں بڑھے ہوئے ہیں، شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی حجۃ اللہ البالغہ عربی انشاء اور علمی زبان کا ایسا نمونہ ہے کہ مقدمہ ابن خلدون کے بعد سے ان صدیوں میں اس سے بہتر نمونہ نظر نہیں آتا۔''(5)

حضرت شاہ ولی اللہ نے شاید علوم اسلامیہ کا کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جس پر انہوں نے اسلام کی اصل روح کے مطابق مواد فراہم کرکے تجدید دین کا فریضہ انجام نہ دیا ہو۔ بعد کے ادوار میں اُن کی فکر پر اہالیان برصغیر کاربند رہے اور مختلف ادوار میں علماء اسلام فکر شاہ ولی اللہ ہی پر لوگوں کی رہنمائی کرتے رہے۔ جنہوں نے اپنے عہد میں تجدید و احیائے دین کے اس سفر میں اپنا حصہ ڈالا۔ حضرت علامہ اقبال نے بھی تشکیل جدید پر انمول لیکچرز دیے تاآنکہ اللہ تعالیٰ نے عصر حاضر میں تجدید واحیاء دین کے لیے ایک ہستی کا انتخاب کیا جو نئے حالات اور تقاضوں کے مطابق تجدید و اقامت دین کا ایک ایسا منفرد کار نامہ انجام دے رہے ہیں جس کے نہ صرف اپنے بلکہ غیر بھی معترف ہیں۔ میرے نزدیک وہ عظیم ہستی ڈاکٹر محمد طاہر القادری وہ نابغہ روزگار شخصیت ہیں جنہوں نے علوم اسلامیہ کی تشکیل نو کی ذمہ داری اٹھائی اس کے لیے نصاب علم کی بھی تشکیل کی۔ اس لئے کہ حصول علم کا ذریعہ نصاب ہے ایک معیاری نصاب سے معیاری علم کا حصول ممکن ہوتا ہے اگر نصاب

---

(4) خلیل الرحمٰن، چشتی، ڈاکٹر (2004ء)، احیائے دین اور مولانا مودودی، ادارہ منشورات، لاہور، ص 7.

Khalil-ur-Rahman, Chishti, Dr. (2004), Iḥyāʾ-e Dīn aur Maulānā Mawdūdī, Idāra Manšūrāt, Lahore, p.7.

(5) ندوی، ابوالحسن علی، مولانا سید، پاجا سراغ زندگی، کراچی، مجلس نشریات اسلام، 1978ء، ص: 120۔

Nadwi, Abū al-Ḥasan ʿAlī, Maulānā Sayyid, Pā Jah Surāgh-e Zindagī, Karachi, Majlis Nashriyāt Islām, 1978, p.120.

ہی اعلیٰ ہو تو علم بھی کمال درجے کا ہوتا ہے۔ لہذا زمانے کے تقاضے کے مطابق نصاب علم کی تشکیل، علم کی تشکیل نو ہے۔

ہر دور میں تجدید دین کی شخصیات کی موجودگی کے حوالے سے مولانا سید ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں:

''اس دین کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ اصول مقرر اور مقدر کر دیا ہے کہ اس کے لئے زندہ اشخاص برابر پیدا ہوتے رہیں گے۔ کوئی درخت اس وقت تک سرسبز و شاداب اور زندہ درخت نہیں سمجھا جاتا جب تک کہ وہ باثمر نہ ہو۔ اس میں نئی نئی پتیاں اور نئے نئے شگوفے نہ کھلتے رہتے ہوں۔ یہ دین زندہ ہے اور زندہ انسانوں کے لئے اور اس کو زندہ اشخاص کی ضرورت ہے وہ دین مٹ گئے ختم ہو گئے جنہوں نے روحانیت کے میدان میں، علم کے میدان میں، فکر کے میدان میں، قیادت کے میدان میں، زندہ اشخاص پیدا کرنے بند کر دیئے، انسان زندہ اشخاص سے متاثر ہوتا ہے، چراغ سے چراغ جلتا رہا ہے اور چراغ سے چراغ جلنا چاہیے اور جلتے رہنا چاہیے۔''(6)

عصری تقاضوں کے مطابق عام فہم انداز میں علوم اسلامیہ کے نصاب کی تشکیل نو کے بارے میں ڈاکٹر محمد طاہر القادری بیان کرتے ہیں کہ علوم اسلامیہ کے نصاب کے ذریعہ ایسی شخصیات پیدا ہو سکتی ہیں جو اپنی علمی صلاحیت کو بروئے کار لا کر زمانے کے اسلوب کے مطابق لوگوں کو اپنی بات سمجھا سکیں اور جدید معاشرہ انہیں کسی ماضی کے زمانے کی مخلوق نہ گردانیں وہ لکھتے ہیں:

''سوسائٹی کے رہنے والے، دین کی رغبت رکھنے والے یا نہ رکھنے والے، معاشرے کے انسانوں سے بات کر رہے ہیں، یعنی ہر قسم کی سوچ رکھنے والے مخاطب ان کی بات کو سمجھیں۔ جیسے اللہ کے پیغمبروں کے سارے لوگ مخاطب ہوتے تھے، صرف سوسائٹی کے شریف آدمی نہیں، بلکہ اُس دور کے بدمعاش لوگ بھی مخاطب ہوتے تھے۔ ابو جہل، ابو لہب غنڈے تو تھے ہی، بدمعاش بھی تھے، جابر بھی تھے۔ معاشرے کے اوپر اکڑے ہوئے لوگ تھے اور ایسی طبیعتیں تھیں کہ مانتی نہیں تھیں، یہ سب اللہ کے نبیوں کے مخاطب تھے۔ عالم اور معلم چونکہ اللہ کے نبی کا نائب ہوتا ہے تو ہمیشہ اُس کے مخاطب سوسائٹی میں اسی قسم کے لوگ ہوں گے۔''(7)

---

(6) ندوی، ابوالحسن علی، مولانا سید، حدیث پاکستان، کراچی، مجلس نشریات اسلام، 1983ء، ص:168۔
Nadwi, Abū al-Ḥasanʿ Alī, Ḥadith Pakistān, Karāchī, Majlis Nashriyāt Islām, 1983, P. 168.

(7) القادری، محمد طاہر، ڈاکٹر (17 مارچ، 2021ء)، خطاب نمبر:Ha–112، مدارسِ دینیہ اور عصر حاضر کے تقاضے۔
Al-Qādrī, Muhammad Tāhir, Dr. (17 Mārch, 2021), Khitāb Number: Ha–112, Madāris-e Dīniyah aur ʿAṣr Ḥāẓir ke Taqāzay.

ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی فکر یہ ہے کہ علوم اسلامیہ کے ذریعہ ایسے لوگ پیدا ہوں جو معاشرے کی زبان میں بات سمجھائیں اس کے لئے علوم کی تشکیل نو ضروری ہے جبکہ تشکیل نو کا اہم اور بنیادی تقاضا نصاب کی عصری مطابقت اور تشکیل ہے۔ ہر درد دیں رکھنے والا اہل علم اس بات کو بخوبی محسوس کر سکتا ہے جیسا کہ ماضی قریب کے معروف عالم مولانا مناظر احسن گیلانی نے دینی علوم کے نصاب میں ضروری تقاضوں کو اس طرح بیان کیا ہے:

''ہر قابل ذکر اسلامی ملک میں مسلمانوں کی اعلی تعلیم میں قرآن (تفسیر) حدیث، فقہ، عقائد کی علمی تعلیم صحبت و بیعت کے ذریعہ سے ہوائے دل کے تازہ واروں میں سیرت کی پختگی، کردار کی بلندی اور سب سے بڑی چیز بھی للھیت یا اخلاص باللہ میں اخلاص باللہ میں رسوخ کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش ہر زمانہ میں کی گئی ہے اور پانچ چیزوں سے مسلمانوں کا تعلیمی نظام کبھی خالی نہیں رہا۔ گویا ان مضامین کی حیثیت موجودہ نصابی اصطلاح کی رو سے لازمی مضامین کی تھی۔''(8)

وہ ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

''مسٹر اور مولانا یا لیڈر اور علماء تعلیم یافتہ یا مولوی بتدریج ان دونوں الفاظ میں کشمکش بڑھتی چلی جارہی ہے۔ ہر ایک دوسرے کے وجود سے بے زار ہے۔ فسق، الحاد، بے دینی کا الزام علماء، تعلیم یافتوں پر عائد کر رہے ہیں۔ تاریک خیال نا واقفیت کی تہمتیں علماء پر تعلیم یافتوں کی طرف سے لگائی جارہی ہیں اور جو کچھ بھی اس کشمکش میں ایک کا رویہ دوسرے کے ساتھ آج چالیس پچاس سال سے ہے۔ وہ ہمارے سامنے ہے دن بدن یہ کشمکش بڑھتی چلی جارہی ہے۔ یہ سارا نظام کی دوئی کی بنا پر ہے۔'' (9)

مسلمانوں نے اگر ماضی میں بڑی بڑی علمی شخصیات اور علمی کارنامے سرانجام دیے ہیں تو اس کے پیچھے نصاب کی وحدت تھی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں:

---

(8) گیلانی، مناظر احسن، مولانا، سید (س ن)، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، مکتبہ رحمانیہ لاہور، ج 1، ص 111
Gīlānī, Manāẓir Aḥsan, Maulānā, Sayyid (s.n.), Hindustān mein Musalmānōn kā Nizām-e Taʿlīm o Tarbiyat, Maktabah Raḥmāniyah Lāhore, v.1, p.111.

(9) ایضا، ج 1، ص ۲۳۸۔
Ibid, v.1, P.238.

''مسلمانوں اور اسلام کے بڑے کارناموں میں ایک کارنامہ تعلیمی نصاب کی وحدت ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ان میں وہی تعلیم یافتہ ہی تھے جو علماء کہلاتے تھے۔ اور وہی علماء تھے جنہیں آج تعلیم یافتہ کہا جاتا ہے فلسفی بھی پیدا ہو رہے تھے اور ریاضی داں بھی، حکیم بھی مہندس بھی محدث بھی مفسر بھی، طبیب بھی، فقیر بھی، شاعر بھی، ادیب بھی، صوفی بھی، لیکن یہ کیسی عجیب بات تھی کہ ساری تعلیم کا ایک ہی نظام تھا جس سے یہ ساری مختلف پیداواریں ہوئیں''۔(10)

مغربی استعمار سے آزادی کے بعد مختلف اسلامی ممالک میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید پر کام کرنے کے لیے بہت سے تحقیقی ادارے وجود میں آئے، مجمع البحوث الاسلامیہ قاہرہ کے زیر اہتمام کئی بار سیمینارز اور کانفرنسز کا انعقاد ہو چکا ہے عام طور پر ان کا نفرنسز کا عنوان تھا''الاجتھاد فی شریعہ الاسلام''۔ اس موضوع پر پہلی موتمر مارچ ۱۹۶۲ء میں جامعہ ازھر میں منعقد ہوئی۔ کویت میں حکومت کے تعاون سے ہر سال اعلیٰ پیمانے پر ایک انٹرنیشنل سیمینار منعقد کیا جاتا ہے۔ جس میں دنیا بھر کی مسلم شخصیات جمع ہوتی ہیں اس سالانہ سیمینار کا عنوان "ندوۃ مستجدات الفکر الاسلامی'' (فکر اسلامی کے جدید پہلو) ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز کے تحت ۱۹۷۶ء میں بڑے پیمانے پر ایک سیمینار نئی دہلی میں ہوا، جس کا موضوع تھا فکر اسلامی کی تشکیل جدید "اس سیمینار میں برصغیر کے منتخب علماء اہل فکر نے اسلامی علوم کے مختلف پہلوؤں پر اپنے خیالات پیش کیے۔ اس کے علاوہ موجودہ زمانے میں اس کی طرف انفرادی واجتماعی کوششیں کی جارہی ہیں۔ ان کے نتائج شاید ابھی فوری نہ نکل سکیں۔

انیسویں صدی میں جب مسلمانوں کو مغربی اقوام اور جدید مسائل سے واسطہ پڑا تو مصر، ترکی اور ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے یہ آواز بلند ہونے لگی کہ اسلام میں بھی ریفارم لاؤ تا کہ اس کو بدلے ہوئے زمانے کے مطابق بنایا جائے مگر یہ قیاس مع الفارق (یہ وہ قیاس ہے جس میں اصل اور فرع کو بغیر کسی علت کے جمع کیا گیا ہے۔) تھا۔ دوسرے مذاہب تغیرات کا شکار ہونے کی وجہ سے اپنی اصلیت کھو بیٹھے۔ اس بنا پر بدلے ہوئے حالات میں ان میں "اصلاح" (Reform) کے عمل کی ضرورت پیش آئی مگر اسلام کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ اسلام ایک محفوظ اور ابدی اقدار کا حامل دین ہے۔ اسلام آج بھی فطرت انسانی کے ساتھ اتنی مطابقت

(10) گیلانی، مناظر احسن، مولانا، سید (س ن)، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، مکتبہ رحمانیہ لاہور، ج 1، ص ۲۳۸۔
Gīlānī, Manāẓir Aḥsan, Maulānā, Sayyid (s.n.), Hindustān mein Musalmānōn kā Nizām-e Taʿlīm o Tarbiyat, Maktabah Raḥmāniyah Lāhore, v.1, p.238.

رکھتا ہے جتنا کہ اول دن سے وہ مطابقت رکھتا تھا۔مثال کے طور پر بعض مذاہب میں ذات پات کا تصور پایا جاتا ہے۔اس تصور کی بنیاد کوئی علمی و اخلاقی اصول نہیں بلکہ محض پیدائش کا ایک اتفاقی حادثہ ہے۔اس قسم کا عقیدہ قدیم دنیا میں تو چل سکتا تھا مگر آج کی دنیا میں قبولیت عامہ حاصل نہیں کر سکتا۔اس لیے ضروری ہے کہ اس میں بہتری لائی جائے اور اسے عہد حاضر کے تسلیم شدہ تصورات کے مطابق بنایا جائے جبکہ اسلام کے لیے اس قسم کا کوئی مسئلہ نہیں کیونکہ اسلام میں اول دن سے ہی مساوات کا تصور موجود ہے۔نجیب اللہ ندوی لکھتے ہیں:

''اسلام کے تصور انسانیت اور عہد جدید کے تصور انسانیت میں کوئی ٹکراؤ نہیں تاہم زمانی تبدیلی ایک الگ مسئلہ ہے، وہ عین فطری ہے مگر یہ تبدیلی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ از سر نو تطبیق کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کا حل اصلاح نہیں، اجتہاد ہے۔اصلاح خود اصل مذہب میں ترمیم کے لیے ہوتی ہے جبکہ اجتہاد کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کے ابدی احکام کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کر کے اس کو سمجھا جائے اور پھر اس کو اس کی اصل سیرت کے ساتھ نئے حالات پر از سر نو منطبق کیا جائے۔ریفارم اگر نظر ثانی کا نام ہے تو اجتہاد تطبیق نو (Re application) کا(نام ہے)۔''(11)

اٹھارویں صدی سے پوری مسلم دنیا میں جتنی بھی تحریکیں اُٹھیں وہ سب کی سب تھوڑے بہت جزوی اختلاف کے ساتھ احیائی یا رجعت پسندانہ تھیں، نہ کہ تعمیری انقلابی یا ترقی پسندانہ۔اس سب کے باوجود برصغیر میں شاہ ولی اللہ کی تحریک نے مسلمانوں میں ایک نئی فکر ضرور پیدا کی اور ان کو ماضی کی کوتاہیوں کا احساس دلایا۔اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر شاہ صاحب کی تحریک نہ ہوتی تو جمال الدین افغانی، سرسید احمد خان اور علامہ اقبال کے لیے وہ پس منظر نہ بنتا اور نئی فکر کے وہ امکانات ہمارے سامنے نہ آتے جو آئے۔یوں تو اس عہد میں دنیائے اسلام کے مختلف حصوں میں مختلف شخصیات اُبھر کر سامنے آئیں جیسے مصر میں شیخ محمد عبدہٗ طنطاوی، یا ترکی میں نامک کمال لیکن جہاں تک برصغیر کا تعلق ہے جمال الدین افغانی (۱۸۳۸ء-۱۸۹۷ء) وہ پہلے شخص تھے جنہوں

(11) ندوی، نجیب اللہ (س،ن)، فکر اسلامی کی تشکیل جدید، ضیاء الحسن فاردتی، شیر الحق، مرتب، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ص ۸۰.
Nadwī, Najībullāh (s.n.), Fikr-e Islāmī kī Tashkīl-e Jadīd, Ziyā' al-Ḥasan Fārdatī, Shēr al-Ḥaq, Murattab, Maktabah Raḥmāniyah, Lāhore, p. 80.

نے زمانے کی نبض کو پہنچانا اور محض اصلاحی یا جہادی تحریکوں سے آگے بڑھ کر ایک نئے فکری دور کا آغاز کیا۔افغانی کے لیے علامہ اقبال کا یہ تاثر بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ:

''اس عظیم الشان فریضے کی حقیقی اہمیت اور وسعت کا پورا پورا اندازہ تھا تو سید جمال الدین افغانی کو جو اسلام کی حیات ملی اور حیات ذہنی کی تاریخ میں بڑی گہری بصیرت کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے انسانوں اور ان کی عادات و خصائل کا بہت اچھا اور مکمل تجربہ رکھتے تھے۔اُن کا مطمع نظر بڑا وسیع تھا اور اُن کو زندگی کی تاریخ کے اندرونی معنوں میں گہری بصیرت تھی اور اس لیے یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی کہ ان کی ذات گرامی ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک مضبوط کڑی یا جیتا جاگتا رشتہ بن جاتی اگر اُن کی انتھک کوششیں صرف اس امر پر مرکوز رہتیں کہ اسلام نے نوع انسانی کو جس طرح کے عمل اور ایمان کی تلقین کی ہے اس کی نوعیت کیا ہے تو آج ہم مسلمان اپنے پاؤں پر کہیں زیادہ مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہوتے۔''(12)

جمال الدین افغانی نے مسلمانوں کو بتایا کہ ان کے سیاسی زوال کا سبب اُن کا علم کے میدان میں پیچھے رہ جانا ہے۔دراصل مغرب کی مشرق پر حکمرانی علم کی جہالت پر حکمرانی ہے۔اور یہ کہ جب تک مسلمان جدید علوم کو نہیں اپناتے وہ سیاسی طاقت و اقتدار بھی حاصل نہیں کر سکتے۔غالباً افغانی وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے توجہ دلائی کہ:

''صدیوں سے مسلمانوں نے علوم کو ''مسلمانوں کے علم'' اور ''غیر مسلموں کے علم'' میں غلط طور پر تقسیم کر رکھا ہے۔اس تقسیم نے مسلمانوں کو علم جدیدہ کے خلاف ایک تعصب میں مبتلا کر دیا ہے۔اور یہ کہ اسلام اور علم مسلم تہذیب میں دو حریفوں کی طرح قائم ہو گئے ہیں۔یہ صورت ختم ہونا چاہیے اور اسلام کی تعبیر و تفسیر علمی بنیادوں پر کرنی چاہیے۔جدید اسلامی معاشرہ جمہوری بنیادوں پر قائم ہونا چاہیے اور عوام پر قانون کی حکومت ہونا چاہیے۔''(13)

---

(12) سید نذیر نیازی(1976ء)، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، نئی دہلی، ص158.

Sayyid Nazīr Niāzī (1976), Tashkīl-e Jadīd Ilāhiyāt-e Islāmiyyah, Naī Dihlī, p. 158.

(13)Nikki R. Keddie, Jamāl al-Dīn Afghānī, A Political Biography, Los Angeles, 1972, p.14-43, 80-85.

اپنے غیر روایتی خیالات کی وجہ سے افغانی کو مصر، ترکی، ہندوستان غرض ہر جگہ علماء کی سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ دینی مسائل کی تشریح، معتزلہ یا اشاعرہ کی طرح یونانی فلسفے یا اسلامی دینیات کے سہارے نہیں بلکہ معروضی اور عقلی انداز سے کرنے کے قائل تھے اور یہ انداز علماء کے لیے سخت ترین بدعت سے کم نہ تھا۔افغانی کا نظریہ علم ایک اعتبار سے اُن کی پوری فکر کا بنیادی عنصر ہے۔وہ علوم کے ارتقائی مظہر کے قائل تھے اور سمجھتے تھے کہ مختلف علوم انسانی سماجی ضروریات کے جواب کے طور پر وجود میں آئے ہیں۔تہذیبی ارتقاء کی مختلف منزلوں پر مختلف علوم تشکیل پاتے گئے۔بنیادی علوم کے ساتھ ساتھ انسان نے روح کے تقاضوں پر بھی توجہ کی کیونکہ اخلاقی فساد کے ساتھ مادّی خوش حالی ممکن نہیں۔چنانچہ فلسفہ اخلاقیات اور فقہ جیسے علوم وجود میں آئے۔(14)افغانی کا نظریہ سماجی ضروریات اور ان کے جواب میں علوم کا ارتقاء کم و بیش وہی نظریہ ہے جو Arnold Toynbee نے برسوں بعد پیش کیا۔بہر حال افغانی کے نزدیک علم وہ چیز ہے جو کسی خاص نسبت یا جغرافیے سے نہیں پہچانی جاتی بلکہ ہر چیز علم سے پہچانی جاتی ہے۔انسانوں کو علم سے نسبت دینا چاہیے نہ کہ علم کو انسانوں سے۔وہ کہتے ہیں:

"کیسی تعجب کی بات ہے مسلمان جن علوم کو ارسطو سے منسوب کرتے ہیں، ان کو نہایت رغبت سے پڑھتے ہیں گویا کہ ارسطو کوئی مسلمان مصنف تھا۔لیکن اگر کسی چیز کو گلیلیو، نیوٹن اور کپلر سے نسبت دی جاتی ہے تو یہ اُسے کفر ٹھہراتے ہیں۔علم کا دارو مدار دلیل ہے اور دلیل نہ ارسطو ہے نہ گلیلیو۔"(15)

افغانی کی اس بات کی صداقت دیکھنا ہو تو آپ آج بھی کسی دار العلوم یا دینی مدرسے میں جا کر دیکھ لیجئے۔

فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی تاریخ میں افغانی کے بعد سرسید احمد خان (۱۸۱۷ء- ۱۸۹۸ء) کی خدمات بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔افغانی نے جو فکری انقلاب پیدا کیا تھا سرسید نے اس کو ایک سمت

(14) میرزا لطف اللہ خان شیرازی (1933ء)، مقالات جمالیہ، طہران، ص135-137.

Mirzā Luṭf Allāh Khān Shīrāzī (1933), Maqālāt-e Jamāliyah, Tehrān, p. 135-137.

(15) ایضاً، ص66.

Ibid, p. 66.

دے دی۔اگرچہ افغانی اور سرسید میں بعض مسائل پر شدید اختلافات بھی تھے جس کی وجہ ان کے مختلف سیاسی رجحانات تھے۔لیکن بنیادی مقصد میں دونوں ایک دوسرے کے ہم خیال اور معاون تھے۔سرسید کی مذہبی اصلاح کے دو بنیادی خیال وہی ہیں جو اس سے پہلے شاہ ولی اللہ اور افغانی کے یہاں مشترک ہیں۔پہلا یہ کہ مذہبی فکر و عمل میں سلف کی تقلید کافی نہیں بلکہ ہر دور میں زمانے کے تقاضوں کا خیال کرتے ہوئے اجتہاد کی ضرورت ہے۔اگرچہ شاہ ولی اللہ اس سلسلے میں اجتہاد مقید کی حدود سے باہر نہ نکل سکے جبکہ افغانی اور سرسید کے یہاں اس طرح کی کوئی پابندی نظر نہیں آتی۔دوسری چیز یہ کہ اسلام کو کل عالم انسانیت کے لیے قابل فہم بنانے کی خاطر عقلی انداز میں پیش کرنا ضروری ہے۔سرسید کی تحریک برصغیر کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا سب سے اہم حصہ ہے۔روشن خیالی، ذہنی بیداری، علم کا بلا امتیاز حصول، جس مشن کوافغانی نے شروع کیا تھا سرسید نے عملی طور سے آگے بڑھایا۔افغانی باوجود اپنی علمی عظمت کے عملی طور پر وہ نتائج حاصل نہ کر سکے جو سرسید نے حاصل کر لیے۔انہوں نے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی بنیاد رکھ کر مسلمانوں کے کم از کم ایک مختصر طبقے ہی کو جدید علوم سے روشناس کرایا۔سرسید جس وقت علیگڑھ کالج قائم کرنے کے لیے کوشش کر رہے تھے علماء کا ایک بڑا طبقہ اس کی سخت مخالفت کر رہا تھا۔اس لیے کہ اُن کے نزدیک انگریزی پڑھنا اور فرنگیوں کا علم حاصل کرنا خلاف شرع تھا۔(16) ایک جلسے میں جب وہ کالج کے لیے چندہ جمع کر رہے تھے ایک عالم دین نے بڑھ کر ایک مٹھی خاک ان کی طرف بڑھائی جس کو انہوں نے دامن پھیلا کر لے لیا، اس کو چوما اور فرمایا کہ یہ مٹی میں کالج کی عمارت کی بنیاد میں رکھوں گا۔اگر سرسید نے علیگڑھ تحریک شروع نہ کی ہوتی تو شاید پاکستان بھی معروض وجود میں نہ آ سکتا۔سرسید نے دین و دنیا کے گہرے تعلق کو ایک لیکچر میں اس طرح واضح کیا تھا کہ دین چھوڑنے سے دنیا نہیں جاتی مگر دنیا چھوڑنے سے وین بھی جاتا ہے۔سرسید کی تفسیر پر کفر والحاد کے فتوے لگ گئے۔(17) لیکن کیا معلوم آنے والے وقت میں جب فکر اسلامی کی تشکیل

---

(16) الطاف حسین حالی(س۔ن)،حیات جاوید،لاہور،ص72.

Alṭāf Ḥusayn Ḥālī (s.n.), Ḥayāt Jāvīd, Lāhore, p. 72.

(17) ایضا،ص518-536.

Alṭāf Ḥusayn Ḥālī (s.n.), Ḥayāt Jāvīd, Lāhore, p. 518-536.

جدید آگئے بڑھے تو سرسید کی تفسیر پر سنجیدگی سے غور ہو۔پروفیسر محمد مجیب کے خیال میں اگر چہ سرسید نے اپنے لیے کبھی اجتہاد کا دعویٰ نہیں کیا لیکن ان کو عصر حاضر کا مجتہد مطلق مانا جاسکتا ہے۔(18)

شاہ ولی اللہ سے شروع ہونے والا مشن افغانی، سرسید اور کچھ دوسرے دانشوروں سے ہوتا ہوا علامہ اقبال (۱۸۷۶ء-۱۹۳۸ء) تک پہنچا جنہوں نے اس کو اپنی فلسفیانہ فکر، مشرق و مغرب کے فلسفے پر عبور اور عصر حاضر کے پیچیدہ اور انتہائی مختلف حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے علم و عقائد میں ایک ہم آہنگی پیدا کرنا چاہی۔فکر اقبال کی ایک بہت بڑی اہمیت یہ ہے کہ انہوں نے بہت سے ایسے سوالات پوری عالمانہ بصیرت اور علمی جرأت و ہمت کے ساتھ اُٹھائے اور بحث کی جن پر اب تک اتنی آزادی اور کھلے ذہن کے ساتھ بات نہیں ہوئی تھی۔اقبال یا کسی بھی مفکر یا فلسفی سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اسطرح کے سوالات کے کوئی حتمی اور پوری طرح مطمئن کرنے والے جوابات مہیا کر دے گا صحیح نہیں ہے اور نہ ہی ایسا کبھی ہوا ہے۔اقبال نے علم اور مذہبی مشاہدات کا تعلق، مذہب اور عقائد کی عقلی توضیحات، ذات الہیہ کا تصور اور اس کے اثرات، انسان کے مختار یا مجبور ہونے کا مسئلہ، حیات بعد الموت، مذہب کی صداقت اور حقیقت، قوانین شریعت اور اجتہاد کی حیثیت، ثبات و تغیر اور نشاۃ ثانیہ، قدیم و جدید فلسفے اور استخراجی اور استقرائی طرز استدلال سے پیدا ہونے والے تضادات اور تفہیم مذہب پر اس کے اثرات اور ان جیسے دوسرے بہت سے سوالات کے جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی اور جواب میں کہا:

''جب ہم ان اصولوں کا جائزہ لیتے ہیں جن پر قرآن نے قانون کی بنیاد رکھی تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے نہ تو انسانی فکر پر کوئی روک تھام ہوتی ہے اور نہ وضع آئین و قوانین پر۔ اس کے برعکس ان اصولوں میں جو وسعت اور رواداری موجود ہےاس سے ہماری فکر کو اور بھی تحریک ملتی ہے۔''

(18)محمد مجیب(1947ء)،The indian Muslims،لندن،ص390.

Muḥammad Mujīb (1947), The Indian Muslims, London, p. 390.

اور پھر اسی خطبے میں وہ آج کے مسلمانوں کو یہ حق دیتے ہیں کہ ''وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں قانون کی نئی تعبیر خود اپنے تجربے اور عہد جدید کے حالات کی روشنی میں کریں۔''(19)

عصر حاضر میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی کاوشیں

مذکورہ بحث میں تجدید واحیاء دین کی تاریخ کا مختصراً ذکر کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ تک شخصیات کا ذکر کیا۔ یہاں میں عصر حاضر میں تشکیل جدید کی کاوشوں کے حوالے سے ایک عظیم شخصیت ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی اجتہادی کاوشوں کا تذکرہ کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا ایک نمایاں کام فکر اسلامی میں اجتہادی کاوشوں کا فروغ اور علوم اسلامیہ کی تدوین نو ہے اس حوالے سے پروفیسر محمد رفیق رقم طراز ہیں:

''آج امت مسلمہ کا بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم نے بالعموم تخلیق اور اجتہاد کا دروازہ بند کر لیا ہے تقلید علم و فن کی معراج بن گئی ہے بلکہ آج اگر کوئی مرد قلندر اجتہاد کا نعرہ مستانہ بلند کرتا ہے تو مخصوص قدامت پرست مذہبی ذہن شد و مد کے ساتھ اس کو دائرہ اسلام سے خارج کر دینے تک کی مہم کا آغاز کر دیتا ہے۔ اس فکری کجی نے ہمیں ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ عالم کفر اقوام عالم میں اسلام کو متروک اور ناقابل عمل دین کے طور پر پیش کر کے انہیں اسلام سے بیزار کر رہا ہے۔

جامعہ کے منفرد طلبہ جو سیرت و کردار علم و عمل، تقویٰ و طہارت حکمت و بصیرت اور صلاحیت و استعداد کے حوالے سے مجتہدانہ اوصاف سے متصف ہوں گے اپنی اجتہادی کاوشوں کے ذریعے نہ صرف عالم انسانیت کو پیش آمدہ مسائل کا ٹھوس اور شافی حل فراہم کریں گے بلکہ زندگی کے تمام تقاضوں کی تکمیل کو قانون کے تابع بنا دیں گے۔ جس سے فقہ اسلامی کا موثر قابل عمل اور بے خطا ہونا چشم عالم پر آشکار ہو جائے گا۔''(20)

---

(19) Muḥammad Iqbāl, Dr. (1947), The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam, Lāhore, p. 161.

(20) محمد رفیق، پروفیسر (1996ء)، قائد انقلاب کی انقلابی جدوجہد، لاہور، منہاج القرآن پبلی کیشنز، ص229

Muḥammad Rafīq, Professor (1996), Qā'id-e Inqilāb kī Inqilābī Jādū Jahad, Lāhore, Minhāj al-Qur'ān Publications, p. 229.

علوم اسلامیہ کی تشکیل جدید کے بارے ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی رائے

ملت اسلامیہ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ صدیوں میں محکوم امت کے علماء اور اہل علم نے ان کے عقائد بچانے کے لئے عبادات کی اہمیت اور فضیلت اور مسائل کے حوالے سے کتب اور شروحات لکھیں بالخصوص فقہ کے عنوان سے جو کتب مدون ہوئیں ان میں ہمہ نوعیت موضوعات کا احاطہ ہوتا ہے نام فقہ ہوتا مگر دیگر ضروری مباحث کا بھی ذکر ہوتا۔اس بارے ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے مبسوط بحث کی ہے۔آپ نے فکر اسلامی کی پوری تاریخ کا خوبصورت بیان کیا ہے۔ان کی رائے میں دورِ غلامی میں فکر اسلامی محدود ہو کر رہ گئی۔

ان کے مطابق عالم اسلام کے برطانوی سامراج کے زیر نگیں آتے ہی شرعی عدالتوں کا خاتمہ ہو گیا۔جب اسلامی نظام رائج تھا تو شرعی عدالتوں کا نظام قضا بھی رائج تھا۔کہیں سرکاری اور کہیں نیم سرکاری حیثیت سے شریعت کو آئینی اور قانونی بالادستی حاصل تھی اور شرعی عدالتیں سپریم عدالتیں تھیں۔عثمانی دور حکومت میں شیخ الاسلام کا حکم خلیفہ وقت کے حکم سے بھی بالاتر ہوتا تھا۔ اس دور میں اکثر ایسا بھی ہوا کہ اسلامی عدالت نے ایسے نامزد شدہ حکمرانوں کو کالعدم قرار دے دیا جو حکومت کے اہل نہ تھے۔خلافت بغداد جب زوال کا شکار ہوئی' منگول فتنہ چھا گیا' تاتاری سلطنت تشکیل پائی تو اس دور میں بھی عدالتوں کے ذریعے اسلامی قانون کے نفاذ و ترویج کو وہ بھی نہ ختم کر سکے کیونکہ اسلامی شرعی عدالتوں کے نظام کو معاشرے میں استحکام حاصل تھا مگر نئے سامراجی اور استعماری نظام کے تحت شرعی قانون کو شخصی قانون (Personal Law) بنا دیا گیا۔اس دور تسلط میں شرعی عدالتوں میں شخصی قانون شرعی تھا مگر دیگر تمام معاملات میں قانون سیکولر ہو گیا۔ اقتصادی' سیاسی' تعلیمی اور زندگی کے دیگر معاملات سیکولر لاء کے تحت ہو گئے جس کے نتیجے میں زندگی دو اکائیوں میں تقسیم ہو گئی یعنی دین و لادین اکائیاں الگ الگ ہو گئیں۔اس سے قبل زندگی ایک وحدت تھی اور عدالتیں بھی قانون کو ایک وحدت کے طور پر نافذ کرتی تھیں۔اب نکاح' طلاق' وراثت' عبادات وغیرہ کے مسائل تو شرعی دائرہ میں تھے مگر کاروباری معاملات معاہدات' تجارت' اقتصادیات' عقوبات وغیرہ سب سیکولر ہو گئے۔تعزیرات' شہادات' تفتیش' عدالتوں کی تشکیل' فیصلے کا طریق کار یہ سب امور سیکولر قرار پائے اس کا اثر علمی کاوشوں پر بھی ہوا۔اس کے زیر اثر اسلامی ممالک میں دور زوال میں (اور تاحال) اسلامی قانون کے حوالے سے جو بھی کام ہوا وہ سب شخصی دائرے میں ہوا۔اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ فقہی اور قانونی طور پر عملی زندگی میں کتنا

زیادہ تغیر آیا اور عملی زندگی کے حوالے سے شریعت کا دائرہ کتنا تنگ کر دیا گیا۔عثمانی ترکوں کے آخری دور میں بھی جو فقہی اور قانونی کام ہوا وہ مجلۃ الاحکام العدلیہ تیار ہواجودفعات پر مشتمل سول لاء تھا۔

اس دور زوال میں القوانین الشخصیہ کے نام سے مصر میں قانون بنا' لیبیا میں قانون سازی شخصی دائرہ میں ہوئی۔اردن' شام' عراق اور پاکستان میں شخصی قانون سازی ہوئی مسلم فیملی لاء آرڈیننس تیار ہوا یعنی ذہنی طور پر یہ تسلیم کر لیا گیا کہ اسلام کا تعلق صرف نکاح' طلاق اور وراثت کے مسائل سے ہے۔ڈی ایف ملا نے اسلامک لاء پر کتاب لکھی جو آج تک ایک ٹیکسٹ بک کی حیثیت رکھتی ہے وہ بھی فیملی لاء پر ہے۔وہ دستور' سیاسی' اقتصادی معاملات Torts وغیرہ سے بالکل بحث نہیں کرتے۔بین الاقوامی معاملات عقوبات 'Procedural Law ' عقوبات تعزیرات کا اس میں کوئی ذکر نہیں۔پاکستان میں بھی قانون سازی اسی نہج پر ہوئی۔پاکستان کی عدالتوں میں نکاح' طلاق وغیرہ کے تمام فیصلے شرعی قانون کے مطابق ہوتے ہیں۔ ء کے لگ بھگ Dissolution of Muslim Marriage Act بنا تھا اس میں ترمیم ہوئی اور اسے لے کر آگے چلتے رہے اس طرح باقی ساری زندگی سیکولر لاء میں چلی گئی اور زندگی کی دو اکائیاں بن گئیں اور دور زوال میں اسلامی دنیا کی قانون سازی میں شخصی قانون سازی کا دائرہ اپنا لیا گیا جبکہ زندگی کی وحدت کو دینی و لادینی اکائیوں میں تقسیم کر دینے سے درج ذیل نتائج نکلے۔

) جب دو سو سال تک زندگی دو اکائیوں میں تقسیم ہو کر چلتی رہی اور اس میں کئی نسلیں گزر گئیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مذاہب اربعہ میں کسی ایک مذہب کی تقلید کا جو تصور چلا آ رہا تھا وہ آخرکار جمود اور تعطل میں بدل گیا اور عملی زندگی سے متعلق شرعی تحقیق اور فقہ جامد ہو گیا کیونکہ تحقیق فتاوی کا دائرہ کار کلیتہً شخصی قانون ہو گیا، زندگی کے دوسرے عملی گوشے پہلے ہی شخصی قانون سے نکال دیئے گئے تھے۔ان کے بارے میں کسی کو علماء سے استفسار کی ضرورت ہی نہ رہی چونکہ معاشرے میں دو قانون مروج تھے تو علماء سے طلاق، نکاح، طہارت، عبادات، مناکحات، وراثت و جنازہ وغیرہ کے مسائل ہی پوچھے جانے لگے۔اب علماء کا غور و خوض، فکر تحقیق اور ارتقاء سب اسی دائرے تک محدود ہو گیا اس میں تصنیف، تالیف، افتاء وغیرہ کا تحرک جاری رہا اور باقی ساری زندگی شرعی مسائل کے دائرے سے کٹ گئی چونکہ شخصی معاملات سے

متعلق مسائل میں اجتہاد کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تو تقلید کے تصور کا جمود و تعطل کا شکار ہو جانا ایک فطری نتیجہ تھا۔اس دور میں لکھے جانے والے فتاویٰ مثلاً فتاویٰ دیوبند، فتاویٰ رضویہ، فتاویٰ ثناء اللہ امرتسری وغیرہ میں ساری تحقیق کا دائرہ طہارت، عبادات، تیمم، وضو، اذان، امامت، اقتداء و نماز وغیرہ کے مسائل ہیں اور باقی مسائل پر چند باب بھی نہیں ملے۔

)اجتہاد طلب مسائل کو شرعی دائرے سے خارج کر دیا گیا' زندگی کے ہزاروں ایسے مسائل تھے جن میں قوم کو رہنمائی فراہم کرنے کی ضرورت تھی مثلاً مختلف معاشرتی طبقات(Communities) باہم کس طرح ملیں گے؟ سیاسی، اقتصادی، عدالتی، حکومتی، بین الاقوامی، بینکاری، طبّی میدان جیسے ہزارہا ایسے مسائل تھے جن میں تحقیق کی ضرورت تھی مگر چونکہ ان مسائل میں کوئی رہنمائی کے لئے شرعی و دینی فکر سے رجوع کرنے کے لئے تیار نہ تھا کہ یہ مسائل سیکولر فکر کے تحت کر دیئے گئے تھے نتیجتاً ان تمام دائروں میں کوئی تحقیقی و تخلیقی کاوش نہ ہو سکی۔

)اجتہاد کے دروازے کلیتہً بند کر دیے گئے اگر شرعی عدالتوں کا جامع نظام بند نہ کیا جاتا تو زندگی کے تمام مسائل شریعت کے تابع رہتے اور اجتہاد کے دروازے بھی کھلے رہتے کہ زندگی کے تمام مسائل میں شریعت کی طرف رہنمائی کے لئے رجوع کیا جاتا مگر اب یہاں تحقیق کا دائرہ محدود ہو کر رہ گیا وہ اور جو بھی تحقیق ہوئی وہ فقہ کے انتہائی محدود دائرے کے اندر ہوئی جس کے گواہ اس دور کے فتاویٰ ہیں۔

جبکہ امام اعظم کے اجتہاد سےلاکھ سے زیادہ مسائل مدون ہوئے اس طرح آپ کے تلامذہ نے فقہ حنفی کی تدوین کے حوالے سے جو کام کئے ان میں سے دو تہائی یا اس سے بھی زیادہ سیکولر نوعیت کے ہیں۔جبکہ ایک تہائی سے بھی کم طہارات و عبادات وغیرہ پر ہے ایک اندازے کے مطابق قرون اولی کا ذخیرہ علم فقہ 9/10 حصہ حقوق العباد سے متعلق ہے 1/10 حصہ حقوق اللہ سے متعلق ہے۔ اس سے علم شریعت میں سیکولر معاملات کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے اب جب فقہی معاملات میں دائرہ تحقیق محدود ہو گیا تو دوسرا دائرہ عقائد کا سامنے آیا اب اس باب میں مباحث کا آغاز ہو گیا کہ کیا اللہ جھوٹ بول سکتا ہے؟ (معاذ اللہ) کیا حضور کا مثل بنانے پر اللہ قادر ہے؟ (معاذ اللہ) ان مسائل کو شاہ اسماعیل دہلوی نے چھیڑا اور مولانافضل حق خیرآبادی نے ان

کا رد کیا غرضیکہ اب شفاعت، توسل، علم الغیب، معجزات، تصرف، حاضر و ناظر، نور و بشر وغیرہ جیسے موضوعات ہی دائرہ تحقیق قرار پائے۔یہ ان دو صدیوں کی علمی تحقیق کا حاصل تھا۔

اب تقلید کا نیا مفہوم سامنے آیا حقیقت میں تقلید یہ تھی کہ مذاہب اربعہ کی موجودگی میں کوئی نیا مذہب بنانے کی ضرورت نہیں۔ان میں سے کسی ایک کی پیروی کریں اس کے علاوہ کوئی بھی جو تقلید کے معنی پر اضافہ کرتا ہے وہ دین اور شریعت پر ظلم کرتا ہے۔تقلید کے اس معنی کو اختیار اس لئے کیا گیا کہ کوئی شخص' گروہ یا جماعت مل کر مذاہب اربعہ (یا مذاہب خمسہ) میں کوئی نیا مذہب نہ شروع کر دے مذاہب اور بھی تھے مگر امت کے تسلسل نے ان کو ختم کر دیا اور وہ وقت کے ساتھ نہ چلے سکے جو مذاہب چودہ سو سال سے چل رہے ہیں ان میں اتنی وسعت و لچک اور ارتقاء کے ضابطے ہیں تو کسی نئے مذہب کی ضرورت ہی نہیں تھی۔اب آپس میں مسائل کے مابین تبادلے کی صورتیں بھی ہیں۔یہ بھی تقلید کے خلاف نہیں یہ دور بھی ایسا ہے کہ مسائل اس قدر پیچیدہ ہو گئے ہیں تاہم ان کو آپس میں گڈمڈ کرنے کی اجازت نہیں ہے کہ نماز حنفی' روزہ شافعی' نکاح حنبلی اور طلاق مالکی طریقے پر دے دیں۔

فقہ قرآن و سنت کے احکام کی منظم (Codified)شکل میں تشریح و توضیح ہے۔امت پر ان آئمہ کا احسان ہے بصورت دیگر امت کے اندر زندگی میں وحدت اور یکسانیت پیدا ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ان آئمہ کرام نے تمام اختلافات روایات کی چھان بین اور تطبیق کر کے مذاہب کی شکل میں اسلامی قانون مدون کر کے امت کو دیا۔اس لئے چاروں مذاہب حق قرار پائے اور یہ ضابطہ ٹھہرا کہ ان میں سے کسی ایک کی پیروی کی جائے۔

مگر تقلید کا مفہوم یہ ہر گز نہیں کہ کسی مسئلے پر کوئی اختلاف بھی نہیں کر سکتا۔تقلید کا یہ تصور دراصل تقلید نہیں بلکہ جمود اور تعطل ہے اب رائج تصور تقلید یہ ہے کہ کوئی مجتہد ہو ہی نہیں سکتا کسی بھی معنی میں نہیں (مجتہد فی المسائل بھی نہیں) جو کوئی بھی ہو گا وہ مقلد ہی ہو گا۔ اب مقلد کہ کتاب و سنت کے دلائل سے بحث کا اختیار بھی اس کے پاس نہیں دلیل سے بحث کرنے کا اختیار صرف مجتہد کے پاس ہے چونکہ مجتہد کوئی پیدا نہیں ہو سکتا اور اس کا اختیار مجتہد کے پاس ہے تو دلیل کا کام یہ رہ گیا کہ اسے طاق نسیاں کی زینت بنا دیا جائے بالفاظ دیگر کتاب و سنت سے عملاً لاتعلقی کا نام تقلید قرار پایا۔

تقلید کا مندرجہ بالا تصور اپنانے کا اثر یہ ہوا کہ اس باب میں شدید ردعمل سامنے آیا تمام وہ مکاتب فکر جو فقہ کے خلاف ہیں وہ اس کا ردعمل تھے جوائمہ اربعہ کے خلاف رکھا گیا اور فقہ کو خلاف شریعت ثابت کیا گیا ورنہ اس دور سے پہلے ہزار' بارہ سو سالہ دور میں ایک بھی ایسا عالم نہیں ملتا جس نے فقہ کی مخالفت کی ہو اور اسے فقہ کہہ کر مسترد کر دیا ہو۔پہلے اختلاف فقط فقہی مسائل میں ہوتا تھا۔ابن تیمیہ اورابن قیم حنبلی المذاہب تھے۔محمد بن عبدالوہاب نجدی جو اپنی شدت و تعصب کی وجہ سے تاریخ اسلام میں اپنی مثال نہیں رکھتے مذہباً حنبلی تھے وہ بھی حنبلی مذہب کو نہ چھوڑ سکے۔یہ الگ بات کہ وہ عقائد وغیرہ کے باب میں ا س سے نکل گئے۔موجودہ صورتحال دراصل انتہا پسندی کا ردعمل تھی کہ عرب سے ہی فقہ کے خلاف سلفی تحریک شروع ہوئی حالانکہ سلف تو سارے فقہ پر چلنے والے تھے جبکہ یہ خلف تو سلفی نہیں خلفی تحریک کے علمبردار ہیں۔اس دور میں بعض ایسے لوگ بھی سامنے آئے جنہوں نے کلیتہً فقہ کا انکار کیا بعض نے اسلاف کے اجتہاد کے خلاف نقطہ نظر اپنایا گو کلیتہً فقہ کا انکار نہ کیا بعض (مثلاً امین احسن اصلاحی) نے فقہی مذاہب و مجتہدین کے کام کی اہمیت کا انکار کیا بلکہ فنی بنیادوں پر اکثر حدیثوں کا انکار کر دیا کہ ذخیرہ حدیث ازسرنو مرتب ہونا چاہئے اور فقط قران پر انحصار کیا گو انہوں نے علمی طور پر حدیث کا انکار نہ کیا مگر عملاً کر دیا مثلاً مسئلہ رجم جو حدیث سے ثابت ہے وہ اسے نہیں مانتے۔جس طرح صرف فقہائے کرام کے کام کو ہی کل شریعت قرار دینے والے اجتہاد کے علمی طور پر قائل ہیں مگر عملاً نہیں۔حدیث کا عملاً انکار کرنے والے حدیث کی تشریعی حیثیت (Legislative capacity) کو نہیں مانتے صرف تشریحی حیثیت (Interpretive capacity) کو مانتے ہیں یہی نقطہ نظر پرویز کا ہے ورنہ تشریحی حیثیت تو صحابہؓ سے آج تک ہر ایک کو درجہ بدرجہ حاصل ہے گویا اجتہاد کا دروازہ بند کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ شریعت اور اصول شریعت سے بالکل کورے لوگوں، مفکروں، ادیبوں، وکلاء اور دانشوروں نے خود اپنی رائے کو اجتہاد کا درجہ دے دیا اور اپنی مجرد رائے کا نام اجتہاد رکھا دیا اور ہر ایک نے اپنے اجتہاد کا دروازہ کھول لیا۔

دور جدید کے مسائل کا حل تشنہ رہ گیا۔موجودہ مسائل مثلاً بینکنگ، سود، انشورنس، جدید طبّی مسائل کی پیچیدگیاں وہ مسائل ہیں جن کے متعلق کتب فقہ ہمیں کوئی رہنمائی نہیں دیتیں۔انہیں حل کے لئے تحقیق و اجتہاد کی ضرورت ہے کیونکہ فقہ ہر دور کے تقاضوں کے مطابق قرآن

و سنت کی روشنی میں منظم قانون ہے اور ہر فقیہ اپنے دور کا قانون دان (Jurist) تھا۔تاہم یہ کتاب و سنت کا متبادل ہرگز نہیں۔آج کے دور کے تقاضوں کے مطابق یہ امر ضروری ہے کہ آج کتب فتاویٰ کے نفاذ کی نہیں بلکہ کتاب و سنت میں قانون شریعت کے نفاذ کی بات کی جائے جس کی تعبیر و تشریح اس فقہ کی بنیاد پر ہو گی جو ملک کی اکثریتی آبادی کا فقہ ہے اور اس راہ میں پیش آمدہ تعطل اور پیچیدگیوں کو تمام مذاہب کو سامنے رکھ کر حل کیا جائے گا۔

دور زوال سے قبل اسلام کی تاریخ میں ایک ہی نظام رائج تھا جس میں مذہبی اور غیر مذہبی دونوں علوم پڑھائے جاتے تھے،تعلیم کے دو شعبے ہیں:

1۔مذہبی علوم 2۔غیر مذہبی علوم

1۔مذہبی علوم (Religious Sciences)

یہ وہ علوم ہیں جن کے ماخذ قرآن و سنت ہیں۔

2۔غیر مذہبی علوم (Secular Sciences)

وہ علوم جو خالصتاً مذہبی معاملات کے لئے نہیں بلکہ جو دنیوی معاملات کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔

اسلام کی تاریخ میں یہ دونوں علوم یکجا تھے۔دینی مدارس میں طب، ہیئت، ہندسہ، ریاضی، جیومیٹری، جغرافیہ وغیرہ درس نظامی کا حصہ تھے۔اس دور میں سات علوم درس نظامی میں پڑھائے جاتے تھے۔مذہبی علوم میں تفسیر و اصول تفسیر، حدیث، فقہ، اصول حدیث، اصول فقہ، علم الکلام و علوم معانی شامل تھے اور غیر مذہبی علوم میں طب، ہندسہ، ریاضی، جغرافیہ، ہیئت، منطق اور فلکیات شامل تھے۔ان غیر مذہبی علوم کا کوئی بھی ایسا حصہ نہیں جو تفسیر، حدیث یا فقہ کو سمجھنے میں مدد دیتا ہو مگر یہ ایک ساتھ چلتے تھے اور یہ سارا دینی نصاب کہلاتا تھا کیونکہ اس دور میں علماء کے ذہن میں مذہبی و غیر مذہبی علوم کا جداگانہ تصور کوئی نہ تھا مگر شومئ قسمت یہ کہ آج سائنس اور انگریزی تعلیم کو علیحدہ تصور کیا جانے لگا اور انہیں حاصل کرنے والے کو کافر کہا جانے لگا اور یہ تصور کیا جانے لگا کہ ان علوم کو حاصل کرنے والے کا دینی علوم و دین کے ساتھ کوئی علاقہ نہیں۔

حالانکہ دور اولی میں فارابی، ابن سینا جیسے لوگ پیدا ہوئے جو بیک وقت بہت بڑے محقق اور سائنسدان بھی تھے ساتھ ہی عظیم عالم دین بھی۔عالم دین ہوتے ہوئے بھی ان کی سائنس کے علوم میں اتنی زیادہ دسترس تھی کہ آج کی سائنس بھی ان سے مستفیض ہو رہی ہے۔اس دور کے

علماء کے لئے ضروری تھا کہ سائنس کو ساتھ لے کر چلیں۔اگر وہ مکمل سائنس نہ پڑھتے تو مکمل عالم دین نہ بنتے بلکہ ان سائنسی علوم کے بغیر کوئی عالم دین ہی نہیں کہلاتا تھا۔آج سے اڑھائی تین سو سال قبل جدید علوم (Modern Sciences) یعنی فزکس، کیمسٹری اور بیالوجی وغیرہ کا دور نہ تھا ان کی جگہ فلسفہ، منطق، طب، فلکیات وغیرہ تھے اور یہ داخل نصاب تھے۔بعد میں مضامین وسعت پذیر ہونے کی وجہ سے طبیعات، کیمیا، حیاتیات وغیرہ کے ناموں سے موسوم ہو گئے مگر جدید سائنس و ٹیکنالوجی میں ڈھلتے ہی یہ علوم دینی و مذہبی ذہن کے لئے اجنبی اور دائرہ دین سے خارج ہو گئے۔

دور زوال میں دینی نصاب جمود کا شکار ہوا

دور زوال سے قبل علماء دین نصاب میں وقت کے تقاضوں اور ضروریات کے مطابق تبدیلی کرتے تھے اور اس طرح اس میں ترمیم ہوتی رہتی تھی۔جس طرح آج کل پرانے نصاب کی نظرثانی ہوتی ہے۔اس طرح دینی نصاب بھی بدلتا تھا۔یہ تبدیلی غیر مذہبی علوم میں ہوتی تھی۔اصل مذہبی علوم قرآن و حدیث' فقہ وغیرہ میں تبدیلی نہیں ہوتی تھی۔اس طرح دینی نصاب تقریباً چھ ادوار سے گزرا ساتواں ایڈیشن علامہ نظام الدین سہالوی (١٦٧٧۔ ١٧٤ء) نے مرتب کیا جو درس نظامی کے طور پر مشہور ہوا۔جب دور غلامی آیا تو ان کے ذہن جمود کے شکار ہو گئے اور انہوں نے درس نظامی کو ہی آخری ایڈیشن قرار دیا یہاں علوم کی تدریس کا ارتقاء رک گیا۔ذہنوں کے مفلوج ہونے سے دینی نصاب بھی مفلوج ہو گیا اور اسے دور کے بدلتے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے کبھی بھی ریویو نہ کیا جا سکا اور غلامی کے جو اثرات دینی نصاب پر پڑے انہیں مسلمانوں نے قبول کر لیا۔آج سے صدیوں پہلے کے داخل نصاب علوم کو جسے سیکڑوں سال گزر چکے ہیں علماء آج بھی انہیں رائج کرنا چاہتے ہیں حالانکہ تقاضائے وقت ہے کہ آج کے سائنسی علوم کو داخل نصاب کیا جائے اور اس کے ذریعے ذہن کی تربیت کر کے اسے اس قابل بنایا جائے کہ وہ دور نو کی ضروریات کے مطابق قرآن و حدیث کی توضیح کر سکیں۔

جدید سائنسی ترقی نے سائنس کو آج کے جدید انسان کے لئے دین کا درجہ دے دیا ہے اس سلسلہ میں وہ اتنا متشدد اور متعصب واقع ہوا ہے کہ سائنس کے نام پر وہ بعض ایسے حقائق کا بھی انکار کرنے سے نہیں چوکتا جو سائنس کے دائرہ کار میں نہیں آتے اس اندھی روش کا نتیجہ

انسانیت کو دور حاضر کی تیز رفتار مسابقت کی شکل میں ملا ہے جس میں ہر فرد علم کو (چاہے وہ کسی بھی شعبہ حیات سے متعلق ہو) دوسرے فرد/افراد کے استحصال کے بل بوتے پر اپنی ہی افزائش کے لئے استعمال کرنا اپنا حق سمجھتا ہے اس کا حل صرف اسلام ہی دے سکتا ہے جس نے فرد اور معاشرے کے حقوق و فرائض کو باہم مربوط کر دیا ہے۔

مغرب کی علمی و سائنسی فتوحات سے آج کا مسلم ذہن مرعوب ہو کر رہ گیا ہے حالانکہ اس نے مغرب کو اس بلندی و عروج کی ٹھوس بنیاد فراہم کی' مسلم فکر نے نہ صرف مستقبل کی علمی و فکری ترقی کی بنیاد کو استوار کیا بلکہ اپنے سے پہلے ماضی کے افکار (یونانی) کی تطہیر بھی کی اور اسے اپنے خلاق فاعلانہ عمل سے (نہ کہ انفعالی ردعمل سے) اگلی نسلوں کو منتقل کیا۔یہ امر قابل ذکر ہے کہ اگر کسی قوم کی فکر مغلوب ہو جائے تو وہ قوم کبھی بھی دوبارہ زندہ نہ ہو سکے گی مگر غالب فکر مغلوب قوموں کو پھر سے غالب کر دیتا ہے۔تاریخ گواہ ہے کہ چنگیز خان اور ہلاکو خان جنہوں نے مسلمانوں کو تاراج کیا تھا مسلم نظام فکر کی برتری کی بدولت مسلمانوں کو تباہ کرنے والے کردار کے باوجود ان کے پاسبان بن گئے۔

مغربی فکر کی مرعوبیت کا خاتمہ

آج مسلم ذہن مغربی فکر سے مرعوب ہے اس مرعوبیت اور مغلوبیت کا تدارک کرنے کی ضرورت ہے چاہے اس کی اساس مغرب کی فکری برتری ہے یا اس کا سیاسی تفوق بہرطور مسلم ذہن کا اپنی فکر پر اعتماد بحال کرنا ضروری ہے جو اس کی حیات نو کے لئے اساس زندہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ماضی قریب کے ایک جانی پہچانی علمی شخصیت مولانا ابوالحسن ندوی نے مغربی فکر سے مرعوب ہونے کے بجائے اپنے نصاب تعلیم عصری ضروریات سے ہم آہنگ کرنے پر زور دیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''ہمارے نصاب تعلیم کا یہ ایک اہم مسئلہ ہے کہ یہ نصاب اپنی خوبیوں اور امتیازات کے باوجود دیگر ضروریات کو مکمل نہیں کرتا، کوئی ایسا شخص جو ذمہ دار اور حقیقت پسند ہو یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہمارا نصاب تعلیم زندگی کی تمام ضروریات پر حاوی ہے۔ہمارا نصاب تعلیم بھی اس کا مدعی اور ضامن نہیں۔نصاب تو در حقیقت اس ملکہ خاص کا

ضامن ہے جو انسان کی زندگی میں قدم قدم پر رہنمائی و قیادت کا کام انجام دے سکے اور انسان کے اندر اتنی استعداد پیدا کر دے کہ وہ کنایوں سے فائدہ اٹھا کر نتائج اخذ کر سکے۔"(21)

مغرب سے اس فکری مرعوبیت و مغلوبیت کے تدارک کی سبیل دو نوعیت کی ہو سکتی ہے۔

1۔علمی و فکری سطح پر مغرب کے افکار و نظام کے کھوکھلا پن کو آشکار کیا جائے۔

2۔ عملی سطح پر ایسا نظام تعلیم متعارف کروایا جائے جو نسل نو کے لئے تشکیل کردار کا کام کرے۔

تاہم یہ کام اس وقت تک ممکن نہیں جب تک قوم کے اندر اس کام کو کما حقہ سمجھنے والا ذہن پیدا نہیں کر لیا جاتا کیونکہ موجودہ نظام تعلیم سے نکلنے والا نوکر شاہی کا وہ طبقہ جو کہ جمود (Status Quo) کا قائل ہے اور اس حالت مستمرہ میں اس کی بقاء ہے کبھی بھی اس طرح کے نظام تعلیم کو اس کی اصل روح کے ساتھ رائج ہوتا نہیں دیکھ سکے گا۔

ڈاکٹر محمد طاہر القادری کہتے ہیں:

"یہ بات ذہن میں رکھ لیں کہ عہد نبوت سے لے کے ہمارے اِس درس نظامی کی آخری ترتیب یعنی پونے تین سو سال قبل تک دینی مدارس کا معنیٰ کبھی یہ نہیں تھا۔کہ وہاں سے پڑھ کے نکلنے والے لوگ صرف نماز کے طریقے جانیں۔روزہ، حج، زکوۃ کو جانیں، نکاح،طلاق، وارثت کے چند ایک معاملات جانیں۔جنازہ، نماز عید اور فقہ کے مسائل جانیں، مدارس اور نصابات اسلامیہ کا مقصد کبھی بھی یہ نہیں تھا۔" (22)

مولانا ابوالحسن ندوی کے نزدیک ہمارے اسلاف ائمہ نے اپنے زمانوں کے تضاضوں کے مطابق علمی خدمات سرانجام دیں ہمیں بھی ان کی تقلید کرنی چاہیے۔اس بارے وہ لکھتے ہیں:

---

(21) ابوالحسن علی ندوی، مولانا سید، پاجا سراغ زندگی، کراچی، مجلس نشریات اسلام، 1978ء، ص:67۔

Nadwi, Abū al-Ḥasan ʿAlī, Maulānā Sayyid, Pā Jah Surāgh-e Zindagī, Karachi, Majlis Nashriyāt Islām, 1978, p. 68.

(22) القادری، محمد طاہر، ڈاکٹر(17مارچ، 2021ء)، خطاب نمبر:Ha–112، مدارسِ دینیہ اور عصر حاضر کے تقاضے۔

Al-Qādrī, Muḥammad Tāhir, Dr. (17 Mārch, 2021), Khitāb Number: Ha–112, Madāris-e Dīniyah aur ʿAṣr Ḥāẓir ke Taqāzay.

''علمائے اسلام کی ذہانت اور جذبہ خدمت نے کبھی منزل پر قیام اور لکیر کا فقیر بننا گوارا نہیں کیا، انہوں نے علم کے چلتے پھرتے قافلہ کا ساتھ دیا۔ ان کا ہاتھ زمانہ کی نبض سے کبھی جدا نہیں ہوا، ان کی نگاہ زندگی کے بدلتے ہوئے تیوروں سے کبھی ہٹی نہیں، انہوں نے اسلام کی خدمت کے لئے جس زمانہ میں جس چیز، جس طرز اور جس اُسلوب کی ضرورت سمجھی، بلا تکلف اختیار کر لیا۔''(23)

وہ مزید لکھتے ہیں:

''خود آپ کا نصابِ تعلیم اس حقیقت کا گواہ ہے کہ علماء اسلام نے کسی ضرورت کے تسلیم کرنے اور کسی مفید و ناگزیر چیز کو قبول کرنے میں کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ یہ نصاب عہد بہ عہد تبدیلیوں اور مختلف علمی و عقلی رجحانات کا نمائندہ ہے۔ اس میں ہر دَور میں اضافہ و ترمیم ہوتی رہی ہے، صرف یہ 100 برس کا زمانہ ایسا ہے جس میں اس نصاب میں کم سے کم تبدیلی ہوئی ہے حالانکہ یہی زمانہ اپنی سیاسی و ذہنی تبدیلیوں کی بناء پر جائز اور ضروری تبدیلیوں کا سب سے زیادہ مستحق و متقاضی تھا۔''(24)

ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے نزدیک برصغیر پاک وہند میں برطانوی سامراج کا جو دور تھا۔ یہ اسلام اور اُمت مسلمہ کے خلاف ایک سازش تھی کہ اُنہوں نے دینی نصاب میں جمود طاری کر دیا اور عصری نصاب میں تحرک جاری رکھا۔ دینی نصابات جو ہر دور، ہر زمانے میں مدارس میں عصری ضروریات کے بالکل ساتھ ساتھ چلتے تھے، وہ عصری تقاضوں کے مطابق ہوتا تھا۔ اُس مدرسے کا نصاب اور وہاں سے نکلنے والا عالم، محقق، محدث، مفسر، فقیہ، مجتہد، کبھی زمانے سے پیچھے نہیں رہتا تھا۔

اگر امام اعظم ابو حنیفہ ہیں تو اپنے زمانے میں، علماء میں اور اہل علم میں سب سے آگے تھے۔ امام مالک اپنے شہر میں سب سے آگے تھے۔ امام شافعی سب سے آگے، اِسی طرح امام غزالی سب سے آگے۔ امام عسقلانی، امام قسطلانی، امام سیوطی اور امام تفتازانی سمیت جتنے علماء، مفسرین کو لیتے چلے جائیں۔ وہ اپنے زمانے میں عصری، علمی معیارات میں سب سے آگے ہوتے تھے۔ چونکہ وہ کسی سے پیچھے نہیں رہتے تھے اِس لیے اُن کی عزت اور تکریم بھی ہوتی۔ ایک بنیادی سوال ہے کہ وہ کیوں پیچھے

(23) ابوالحسن علی ندوی، مولانا سید، پاجا سراغ زندگی، کراچی، مجلس نشریات اسلام، 1978ء، ص:116۔
Nadwi, Abū al-Ḥasan ʿAlī, Maulānā Sayyid, Pā Jah Surāgh-e Zindagī, Karachi, Majlis Nashriyāt Islām, 1978, p. 116.

(24) اَیضاً، ص:117۔
Ibid, p. 117.

نہیں رہتے تھے؟اس لئے کہ جیسے ہر زمانے میں تقاضے بدلتے یایوں سمجھیں کہ جیسے عصریات بدلتیں، ویسے نصابات بدل جاتےاور وہ نصاب عصری تقاضوں کو پورا کرتا ہوا آگے آگے چلتا رہتا، تحرک قائم رہتا،لہذا اُس سے ابن سینا بھی پیدا ہوئے، اِسی مدرسہ سے ابن سینا نکلا۔اِسی مدرسہ سے ابن ہیثم ہے، اِسی مدرسہ سے فارابی ہے، اِسی مدرسہ سے رازی نکلے اور اِسی مدرسہ سے باقی محدثین اور ائمہ نکلے۔جب دور جمود اور دور زوال آئے توسامراج نےدین کو کمزور کرنے کے لیے اہل دین اور اہل علم کو کمزور کیا اور کمزور یوں کیاکہ اُن کے نصاب کو جامد کر دیااوراُن سے تحرک نکال لیا۔ (25)

مدارس دینیہ کے نصاب کے بارے میں ڈاکٹر محمد طاہر القادری بیان کرتے ہیں:

پھر برصغیر پاک وہند میں 1947ء تک یہاں انگریز رہے ہیں۔یہ زمانہ اُن کا کم وبیش بیتا ہے۔مگر جوجو نصابات تھے وہ اپنے اُس زمانے کی عصریات کے مطابق بالکل سو فیصد صحیح تھے تو فلسفہ تو کبھی بھی دینی مضمون نہیں تھا۔جب فلسفہ پڑھاتے تھے تو اُن زمانوں کے عصری تقاضوں کے مطابق پڑھاتے تھے۔منطق کبھی علوم دینیہ میں سے نہیں تھا۔عصری تقاضوں کے لیے پڑھاتے تھے۔علم الحساب پڑھاتے تھے،جیومیٹری پڑھاتے تھے،علم ہندسہ پڑھاتے تھے، علم الطب پڑھاتے تھے، علم نجوم پڑھاتے تھے، فلکیات پڑھاتے تھے،یہ سارے کچھ جو علوم پڑھا تے، اِن میں ایک علم بھی دینی علوم میں سے نہیں ہے، علوم دینیہ شرعیہ میں سے نہیں ہے۔یہ سب علوم عصریہ ہیں، یہ ہمارے درس نظامی کے نصاب میں ہوتے تھے،عربی ادب پڑھاتے تھے،اب ادب شعر وشاعری، لٹریچر یہ علوم شرعیہ میں سے نہیں ہے۔یہ بھی عصریہ لینگویج کے تقاضے تھے،تو یہ سارے درس نظامی کا حصہ ہوتے تھے،اپنے زمانے کے مطابق برابر چلتے رہتے مگر جب یہ رک گیا انگریزوں نے یہی تحرک، یہ ارتقاء،یہ ترقی،سکولوں میں،کالجوں میں، یونیورسٹیز میں جاری رکھی، وقتاً فوقتاً نصابات میں نئی ترامیم کرتے رہے تاکہ نئی عصریات کے مطابق اُس کو میچ کرتے رہیں اور پڑھ کے نکلے والے graduate،سکول کے، کالج کے،یونیورسٹی کے graduate پیچھے نہ رہ جائیں۔چونکہ اُن کو

(25) القادری، محمد طاہر،ڈاکٹر(17مارچ،2021ء)،خطاب نمبر:Ha–112،مدارسِ دینیہ اور عصر حاضر کے تقاضے۔
Al-Qādrī, Muḥammad Tāhir, Dr. (17 Mārch, 2021), Khitāb Number: Ha–112, Madāris-e Dīniyah aur ʿAṣr Ḥāẓir ke Taqāzay.

سلطنت دینی تھی اورجن کو سلطنت دینی تھی۔اُن سے دین کو نکالنا تھا۔دین سے دور رکھنا تھااور جن کو دین کا علم دینا تھا۔اُن کو سلطنت اور معاشرے کی باعزت پوزیشن سے دوررکھنا تھا۔تاکہ وہ صرف مخصوص محدود ماحول کی خدمات انجام دینے کے قابل رہ جائیں اور معاشرے میں اُن کا کردار بھر پور کردا ر نہ ہو۔

اب دو سو سال اُس سازش کے گزرے جب وہی کتابیں ساری زندگی پڑھانی ہیں اور آدمی کو کچھ اور نئی کتابیں پڑھنی نہیں پڑتیں۔پھر طبیعتیں آسان پسند ہیں،سہولت پسند ہیں، اُس کے ساتھ طبیعتیں راسخ ہو گئیں۔اِسی میں دو اڑھائی،تین صدیاں گزر گئیں۔سہولت کے ساتھ جم گئیں۔

ڈاکٹر محمد طاہر القادری فرماتے ہیں:

''حضور نبی اکرم ﷺ صحابہ کرامؓ کو جو مضامین پڑھاتے، ان میں قرآن و حدیث، احکام و مسائل، شریعت، تربیت اور سیرت و کردار سازی تو موجود تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ علوم جو شریعت میں سے نہیں ہیں، ان کی تعلیم بھی بطورِ مضمون شامل تھی۔

مثلاً: وراثت کے احکام کا تعلق علومِ عصریہ سے ہے۔اسی طرح ضرورتِ معاشیہ اور ضروریاتِ معاشرتیہ کے علوم بھی شاملِ نصاب تھے۔ریاضی طب، علم فلکیات (Astronomy)، علم نجوم، علم الانساب، Defense & Security، علم الہیت، تجارت، قانون (جس کو فقہ کا نام دیا)، سوشیالوجی، یہ تمام وہ علوم ہیں جن کا ذکر کتبِ حدیث اور کتبِ سیر میں درج ہیں۔صحابہ کرامؓ نے ان علوم کو پڑھا اور ان میں تخصصات حاصل کیے۔اب یہ سارے علوم علومِ شرعیہ نہیں تھے بلکہ علوم عصریہ تھے جو معاشروں، اقوام اور قبائل کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے سکھائے جاتے ہیں۔

پس حضور نبی اکرم ﷺ نے جدت و وسعت کے حامل ایسے نصاب کے ذریعے اپنی امت کی تعلیم و تربیت کا آغاز فرمایا کہ جو نصاب تمام شرعی و عصری علوم اور کثیر زبانوں پر محیط تھا۔آپ

اندازہ کر لیں کہ کتنی بڑی سازش ہوئی کہ ہم اُس وسعت سے محروم رہ گئے، ہم اُس وسعت کا نام ہی نہیں لیتے یہ حضور eنے اپنی نگرانی میں صحابہ کو تعلیم دلوائی ہے اور تربیت دلوائی ہے۔(26)

بہت سے اہل علم حضرات دینی اور دنیاوی علوم میں تفریق کرتے ہیں۔ جبکہ ملت کا درد رکھنے والے علماء اس تفریق کے قائل نہیں ہیں۔ امت کے عروج و ترقی کے لئے نصاب تعلیم میں تمام علوم شامل ہونے چاہییں۔ مولانا ندوی لکھتے ہیں:

''میں علم کی دینی اور دنیوی تقسیم کا بھی قائل نہیں ہوں، میں علم کو ایک صداقت مانتا ہوں یا ایک انسانی تجربہ جو کسی ملک و قوم کی ملکِ نہیں اور نہ ہونی چاہیے، میں زندگی کے دوسرے سرچشموں کی بھی جغرافیائی، نسلی، تاریخی یا سیاسی حد بندیوں کا قائل نہیں، میں علم کو ایک ''وحدت'' مانتا ہوں اور جس کو کثرت کہا جاتا ہے اس کثرت میں بھی مجھے وحدت نظر آتی ہے، علم کی وہ وحدت سچائی ہے، سچ کی تلاش ہے۔''(27)

خلاصہ بحث

زمانے کے ساتھ ساتھ علم بھی ارتقاء پذیر ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ رب العزت نے آقا علیہ السلام کو فرمایا: ''میرے حبیب! آپ عرض کیا کریں: اے رب میرے علم کو بڑھا''۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو اپنے علم کو ہر لمحہ بڑھانے کا فرمایا ہے تو لامحالہ ضروری ہے کہ ہم اپنے نصاب علم کو زمانے کے تقاضوں کے مطابق تشکیل دیں۔ یاد رکھیں علم پڑھنے پڑھانے کے نظام کو نصاب کہتے ہیں اور نصاب کتب پر مشتمل ہوتا ہے۔ جب علم بڑھتا ہے تو نصاب بھی بڑھتا رہے گا نئی نئی کتب شامل نصاب ہوں گی، نئے منہج آئیں گے، نئے اُسلوب آئیں گے، نئے طور طریقے آئیں گے، نئے اشکالات پیدا ہوں گے، نئے سوالات اُبھریں گے۔ نئے اعتراضات دین میں آئیں گے، نئی بداعتقادیاں، نئے انتشار آئیں گے، نئے فتنے کفر والحاد کے آئیں گے، نئی نئی چیزیں آئیں گی۔ اسی طرح نئے معاشی، معاشرتی، سیاسی، دستوری، آئینی مسائل پیدا ہوں گے، ان سے نبٹنے اور انکا حل نکالنے کے لیے ہر زمانے کے مطابق اپنے علم کو آگے آگے

(26) القادری، محمد طاہر، ڈاکٹر (17 مارچ، 2021ء)، خطاب نمبر: Ha–112، مدارسِ دینیہ اور عصر حاضر کے تقاضے۔
Al-Qādrī, Muḥammad Tāhir, Dr. (17 March, 2021), Khitāb Number: Ha–112, Madāris-e Dīniyah aur ʿAṣr Ḥāẓir ke Taqāzay.

(27) ابوالحسن علی ندوی، مولانا سید، حدیث پاکستان، کراچی، مجلس نشریات اسلام، 1983ء، ص: 83۔
Nadwī, Abū al-Ḥasan ʿAlī, Ḥadith Pakistān, Karāchī, Majlis Nashriyāt Islām, 1983, P. 83.

بڑھاتے رہیں گے تو تب جاکے اُس قابل ہوں گے کہ ہم اُس معاشرے میں زندہ رہ سکیں گے۔ حصول علم بھی ایک ارتقائی سفر ہے۔ یہ سفر بھی عصری تقاضوں کے مطابق درجہ بدرجہ تدریجاً کرتے کرتے ممکنہ حد تک کمال کی طرف پہنچنا چاہیئے۔

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.